بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں نئے نظام کی آرزو، جستجو، تلاش اور جدّوجہد اُن افراد، گروہوں، طبقات یا قوموں نے کی ہے جو مروّجہ نظام کے ستم زدہ ہوتے ہیں اور ظلم کی جس چکّی میں وہ پس رہے ہوتے ہیں، اُس سے نجات پانے کے لئے نئی راہوں اور نئی منزلوں کی دریافت کے لئے سرگرداں ہو جاتے ہیں۔ اِس کی تازہ ترین مثال وہ جدّوجہد ہے جو ابھی چند ہی سال پہلے تیسری دنیا کی اقوام نے "نئے عالمی معاشی نظام" کی آواز اُٹھا کر کی تھی اور جس کے لئے اقوامِ متّحدہ کی جنرل اسمبلی کا خصوصی اجلاس ۱۹۷۴ء میں بلایا گیا اور پھر کئی سال تک اقوامِ متّحدہ اور دنیا کے ہر دُوسرے قومی اور بین الاقوامی فورم پر اِس کی بازگشت سنائی دی لیکن وقت کی حکمران اور قابض قوموں نے جن میں امریکہ سب سے پیش پیش تھا، نہ صرف یہ کہ اس آواز پر کوئی کان نہ دھرے بلکہ اُسے خاموش کرنے کے لئے کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا اور بالآخر یہ آواز صدا بصحرا بن کر رہ گئی۔

اِس پس منظر میں کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ آج خُود امریکہ اور اُس کا صدر جارج بُش "نئے عالمی نظام" (New World Order) کی بات کر رہا ہے اور صرف بات ہی نہیں کر رہا اس کے لئے زبان، قلم، تلوار اور ترغیب و ترہیب کا ہر حربہ استعمال کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ نظر مجوّزہ نظام کو ایک بڑے سوالیہ نشان کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ برطانوی اخبار "گارڈین" نے نئے نظام کے بارے میں حال ہی میں دنیا کے چوٹی کے سات مفکرین کے تجزیے کو جس عنوان سے پیش کیا ہے وہ یہی سوالیہ نشان ہے۔(۱) اگرچہ مغرب کے اہلِ نظر اِس نظام کو صرف ایک سوالیہ نشان کے ساتھ دیکھ رہے ہیں لیکن تیسری دنیا اور خصوصیت سے عالمِ اسلام اور مشرقِ وسطیٰ کے اہلِ دانش و بینش صرف ایک سوالیہ نشان ہی نہیں دیکھ رہے بلکہ اُن کو افق پر وہ خُونی آندھیاں بھی صاف نظر آ رہی ہیں جو اِس نظام کے جلو پر اُن کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں۔ چین کے وزیر خارجہ کیون کی چن (Qian Qichan) نے ۱۹ اپریل ۱۹۹۱ء کو صاف لفظوں میں کہا کہ "یہ

خیال بھی اپنے اندر خطرات کا ایک طوفان رکھتا ہے کہ اب دنیا میں صرف ایک سُپر پاور ہو گی جو پُوری دنیا پر چھا جائے۔"

اِس سلسلہ میں پاکستان کے صدر جناب غلام اسحاق خان اور ایران کے رہبر جناب آیت اللہ خامنہ ای کا اعلامیہ امتِ مُسلمہ کے دل کی آواز ہے جس میں اُنہوں نے کہا کہ :

"اسلامی ممالک آج کی دنیا اور نیو ورلڈ آرڈر کے چیلنج سے نمٹنے کے لئے متحد ہو جائیں تاکہ نئے عالمی نظام میں اُن کے مفادات کا احترام کیا جا سکے۔ مسلم ممالک باہم تعاون کریں تاکہ نیا عالمی نظام اُن پر مسلّط نہ کیا جا سکے۔ (وقت کی ضرورت ہے کہ) اِسلامی ممالک باہمی تعاون کے ذریعہ ایک منصفانہ عالمی نظام کے قیام کے لئے سرگرمِ عمل ہو جائیں۔"

(جنگ کراچی ۱۵ ستمبر The News ۱۶ ستمبر ۱۹۹۱ء)

پاکستان اور ایران دنیا کے وہ دو مُسلمان ملک ہیں جنھوں نے اپنا تشخص "اسلامی جمہوریہ" کے دستوری نام کے ذریعہ ظاہر کیا ہے اور اِن دونوں ملکوں کے اِن قائدین کا یہ انتباہ وقت کی پُکار ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ صدرِ مملکت کے اِس دورہ کے اس اہم ترین اعلان کا قومی یا عالمی سطح پر کوئی نوٹس ہی نہیں لیا گیا حالانکہ پاکستان اور امتِ مُسلمہ کے مستقبل کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم سوال ہے ہی یہ کہ اس وقت مغربی اقوام دنیا کا کیسا نقشہ بنانے میں مصروف ہیں اور اِس میں پاکستان' اِسلامی احیاء اور امتِ مُسلمہ کے لئے کیا خطرات پوشیدہ ہیں؟ عالمی سیاست کے ایوانوں میں مستقبل کے لئے کیا سوچ بچار اور منصوبہ بندیاں ہو رہی ہیں' اِن کو نظر انداز کرنا اپنے پاؤں پر خُود کلہاڑی مارنے کے مترادف ہو گا اور اِن کے بارے میں امت کو بروقت متنبّہ کرنا دراصل ان خطرات کے مقابلے کے لئے امت کو تیار کرنے کا ذریعہ بنے گا تاکہ بقول حالی مرحوم :

ع "چھتیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے"

"واشنگٹن پوسٹ" کا نامہ نگار ڈان اوبر ڈو رفر (Dan Orferdorfer) ۲۶ مئی ۱۹۹۱ء کے شمارے میں رقم طراز ہے کہ :

"پچھلے سال ۲۳ اگست کو صدر بش اور اُن کے قومی سلامتی کے مشیر برنٹ اسکو کرافٹ صدر کے چھٹیوں کے مسکن کے قریب بحر اٹلانٹک میں حالاتِ حاضرہ پر غور و فکر اور مچھلی کے شکار کے لئے گئے۔ چار گھنٹے کے بعد وہ واپس آئے اور اس سفر کا حاصل تین مچھلیاں اور خارجہ پالیسی کا ایک نیا تصوّر تھا جو بعد کے دنوں میں صدر بش کی تمام تر گرم گفتاری کا مرکز و محور بن گیا۔ یعنی "نیا عالمی نظام"۔

چند ہی ہفتوں کے اندر نئے عالمی نظام کے نعرہ نے امریکہ کی نئی عالمی پالیسی کے مرکزی

ستوُن کی حیثیت اختیار کر لی۔ امریکی کانگریس کے خطاب سے لے کر اقوامِ متحدہ کے خطاب تک صدر بش نے نئے عالمی نظام کا غلغلہ بلند کیا۔ ڈان اوبرڈ ورفر کے بقول اگست ۱۹۹۰ء سے مارچ ۱۹۹۱ء تک صدر بش نے بیالیس (۴۲) بار اپنے بیانوں اور تقریروں میں اِس نئے نظام کی بات کو پُورے زور شور سے پیش کیا اور اِسے اپنی مستقبل کی پالیسی کی اساس قرار دیا۔ اِس سلسلہ میں جو دعوے کئے گئے اور جن حسین الفاظ کا سہارا لیا گیا ان کی چند جھلکیاں صورتِ حال کو سمجھنے میں ممدّ معاون ہوں گی۔

۱۱ ستمبر ۱۹۹۰ء امریکی کانگرس سے خطاب کرتے ہوئے امریکی صدر نے کہا :

"ہم آج ایک منفرد اور غیر معمولی تاریخی لمحہ کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ خلیج کا بُحران بلا شبہ بہت خطرناک اور گمبھیر بُحران ہے لیکن اِس کے ساتھ ساتھ یہ ایک نادر موقع بھی فراہم کر رہا ہے جس کے نتیجہ میں عالمی طاقتوں کے درمیان تاریخی تعاون کا نیا دَور شروع ہو جائے گا۔ اِن آفت زدہ ایّام کے غبار سے ہمارا پانچواں مقصد برآمد ہو سکتا ہے یعنی -- ایک نیا عالمی نظام ایک ایسا نیا دور جو طاقت کے استعمال کے خطرات سے پاک ہو' جو انصاف کے قیام کے لئے قوی اور توانا ہو اور جس میں امن و سلامتی کا حصُول زیادہ ممکن ہو"(۲)

قومی سلامتی کے مشیر برینٹ سکو کرافٹ نے کہا:

"ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہم ایک نئے عالمی نظام کی ابتدا کر رہے ہیں۔ اور یہ نیا نظام امریکہ اور روس کی مخاصمت کے دَور کے چکنا چُور ہونے سے جنم لے رہا ہے۔"

"ہم حالیہ (خلیجی) بُحران کو ساری دنیا میں اس تصوّر کو منوانے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں کہ صدّام اور عراقیوں کا رویّہ قابلِ قبول نہیں۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ مستقبل کے لئے بڑا اہم ہے۔ ہم اس بُحران سے ایک نیا نظام بنا لینا چاہتے ہیں۔" (۳)

صدر بُش نے ۶ مارچ ۱۹۹۱ء خلیج کی جنگ میں کامیابی کے فوراً بعد دعویٰ کیا کہ :

"اب ہم ایک نئی دنیا کو اپنی آنکھوں کے سامنے اُبھرتا دیکھ رہے ہیں۔"

اپنے اس نئے نظام کے خدّو خال پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید کہا :

"نئے عالمی نظام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اپنی قومی حاکمیت (National Sovereignty) سے دست کش ہو جائیں یا اپنے قومی مفادات کو بھول جائیں۔ یہ دراصل صوُرت گری کرتا ہے اس ذمّہ داری کی جو اس کامیابی نے ہم پر عائد کی ہے۔ یہ جارحیت (Agression) کو روکنے اور استحکام' خُوش حالی اور امن و آشتی کے حصُول کے لئے دُوسری اقوام سے تعاون کی نئی راہیں نکالنے سے عبارت ہے۔ یہ ماحصل ہے اس اُمید کا جو بڑی اور چھوٹی اقوام کے درمیان ایک مشترک عزم پیدا کر رہی ہے۔ اِس کی منزل ایک ایسی دنیا ہے جہاں تنازعات کا حل پُر امن ذرائع سے ہو' جہاں جارحیت

کا مقابلہ سب متحد ہو کر کریں' جس میں اسلحہ کے ذخیروں کو قابو کیا جا سکے اور جس میں تمام انسانوں کے ساتھ انصاف کا سلوک ہو سکے"۔(۴)

ان حسین لفظوں اور دِل پسند دعووں کے ساتھ ساتھ اس نئے عالمی نظام کی سب سے بڑی خصوصیت بھی زبانوں پر آگئی کہ اب امریکہ دنیا کی واحد "سُپرپاور" ہے۔ امریکہ خلیج کی جنگ میں فتح پاکر ویت نام کے ڈراؤنے خواب (Vietnam Syndrome) سے نجات پا چکا ہے اور آنے والے دَور کا نام اب "امریکہ کی صدی" (American Century) ہو گا۔ صدر بش کے یہ الفاظ جو"ٹائم میگزین" کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہُوئے اُنھوں نے کہے تھے بڑے اہم ہیں۔

سوال : آپ نے نئے عالمی نظام کا ذکر کیا ہے۔ کیا دُوسرے الفاظ میں اِس کا یہ مفہوم نہیں کہ امریکہ دنیا کا پولیس مین بن کر رہے گا؟

صدر بش : "صاف بات ہے جب دنیا کو محفوظ جگہ بنانے کی بات ہو تو پھر امریکہ کے شانوں پر ایک غیر مساوی ذمّہ داری (Disproportionate Responsibility) عائد ہوتی ہے۔ مَیں امریکہ کے اس کردار کو عالمی پولیس مین کا کردار نہیں کہوں گا اس لئے کہ ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں جن میں ہم کوئی کردار ادا نہ کریں یا کرنا نہ چاہیں۔ البتّہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک کی سلامتی اور آزادی کے باب میں ہماری ذمّہ داری سب سے زیادہ ہے۔"(۵)

اس فکر اور فلسفہ کا ترجمہ اگر سادہ زبان میں کیا جائے تو اِس کا مطلب' اِس کے سوا کچھ نہیں کہ امریکہ عالمی نظام کے ناخُدا کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا کو ایک منصفانہ عالمی نظام کی طرف نہیں بلکہ "امریکہ کے عالمی نظام" کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ جسے بین الاقوامی تعلقات کی زبان میں Pax Americana کہا جاتا ہے اور اس مجوّزہ نظام کا یہی وہ مفہوم ہے جو کھلے یا دبے' دوست اور مخالف دونوں ہی لینے پر مجبور ہیں۔

یہ بات کہ مجوّزہ نئے نظام کا اصل ہدف ایک "امریکی نظام" کا قیام ہے' محض کوئی مفروضہ یا خیالیہ (FILIGHT OF IMAGINATION) نہیں ہے۔ ہَوا کے رُخ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اِس صدی کے اہم واقعات اور رجحانات پر نظر رکھی جائے اور حال اور مستقبل کی نقشہ بندی کو ماضی کے تناظر میں ٹھیک سمجھا جائے۔

برطانیہ کی عالمی بالادستی (Pax Britanica) کا عملی خاتمہ تو دُوسری عالمی جنگ کے ذریعہ ہُوا۔ لیکن اِمکانی تبدیلی کا آغاز ۱۸۹۸ء میں ہی ہو گیا تھا جب امریکہ نے ہسپانوی افواج کو شکست دی۔ اور جنوبی امریکہ کو بلا شرکتِ غیرے امریکہ کے حلقۂ اثر (Area of Influence) میں

مستحکم کر لیا۔ اس طرح امریکہ علاقے کی بالا ترین قوت اور دنیا کی ایک امکانی قوت کی حیثیت سے میدان میں اُترا۔ ادھر جرمنی اور جاپان اپنے اپنے علاقے میں اُبھر رہے تھے۔ اور بالآخر پہلی عالمی جنگ کے ذریعہ جرمنی نے برطانیہ کے عالمی اقتدار کو چیلنج کر دیا۔ اتحادی قوتوں کے تعاون سے برطانیہ اور امریکہ نے پہلی جنگ جیت لی' لیکن انگلستان کا عالمی طاقت کی حیثیت سے زوال شروع ہو گیا جو بالآخر دُوسری عالمی جنگ میں اپنے فطری انجام کو پہنچا۔ جرمنی اور جاپان نے دو عشروں کے قلیل عرصے میں بالادست طاقتوں کو پھر چیلنج کیا اور اس بار برطانیہ' امریکہ' روس اور فرانس نے مل کر ان نئے دعوئ داروں کو قابو کیا۔ البتہ جنگ کے بعد نقشہ بالکل بدل گیا۔ جرمنی اور جاپان کو مکمل طور پر غیر مسلح کر دیا گیا' جاپان کو اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں ہمیشہ کے لئے دشمن ملک قرار دیا گیا۔ انگلستان ایک بوڑھے پہلوان کی طرح عالمی رول سے ریٹائر ہو گیا اور امریکہ اور روس نئی عالمی قوتوں کی حیثیت سے میدان میں رہ گئے۔ البتہ ۱۹۴۵ء میں جاپان پر ایٹم بم استعمال کر کے امریکہ نے برتری قائم کی' جب کہ روس نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء تک مشرقی یورپ کو اپنے حلقۂ اثر میں لا کر اور پھر ۱۹۴۹ء میں جوہری طاقت بن کر عالمی سیاسی شطرنج کی نئی بساط بچھا دی۔ جنگ کے زمانے کے حلیف بہت جلد حریف بن گئے اور دنیا دو عالمی طاقتوں کے درمیان تناؤ' کشمکش' مسابقت اور بالآخر سرد جنگ کے دَور میں داخل ہو گئی۔

عالمی رسہ کشی کی اس نصف صدی میں امریکہ اور روس دونوں ہی دنیا پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے لئے سرتوڑ کوشش کرتے رہے۔ یہ کشمکش تقریباً" زندگی کے ہر میدان میں ہُوئی۔ نظریہ' سیاست' معیشت' عسکری قوت' سائنس اور ٹیکنالوجی حتیٰ کہ ادب اور ثقافت' ہر میدان میں یہ جنگ لڑی گئی۔ دونوں عالمی طاقتوں نے اپنے اصل وسائل سے بڑھ کر بوجھ اُٹھایا۔ جس کے نتیجہ میں زندگی کے ہر شعبہ میں ترجیحات خلط ملط ہو گئیں۔ قومی دولت کا بڑا حصہ بلاواسطہ یا بالواسطہ جنگ کا ساز و سامان تیار کرنے کی نذر ہونے لگا۔ ایک طرف جنگ کے آلات نے اتنی ترقی کی کہ دونوں بڑی طاقتوں نے صرف جوہری ہتھیاروں کے اتنے انبار لگا لئے کہ کسی ایک کا اسلحہ ہی تمام دنیا کو پچیس بار تباہ کرنے کے لئے کافی تھا اور دُوسری طرف یہ عالم ہُوا کہ دونوں کی عام آبادیوں کے لئے خوراک' رہائش اور علاج کی سہولتیں کم سے کم ضروری حد سے بھی فروتر ہو گئیں۔ سرد جنگ کے اِس دَور میں علاقائی جنگیں اور علامتی مقابلے (Proxy Wars) تو بہتیرے ہُوئے اور اِن میں لاکھوں افراد لقمۂ اجل بنے۔(۶) لیکن عملاً" جنگ اتنی تباہ کن چیز بن گئی تھی کہ بالآخر سرد جنگ کا خاتمہ اندرونی اسباب کی بِنا پر روس کے زوال سے ہُوا اور جہادِ

افغانستان وہ آخری ضرب ثابت ہُوا جس کے بعد روس سنبھل نہ سکا۔

سرد جنگ کے دور میں امریکہ کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں مندرجہ ذیل رہیں:

۱۔ ایشیا اور یورپ پر روس کی بالادستی کے قیام کو روکنا اور اُسے اُن سرحدوں میں محدُود کر دینا جہاں وہ جنگ کے بعد قابض تھا۔ اس کی بنیاد عالمی سیاست کا وہ مشہور اصُول ہے جسے تحدید کی حکمتِ عملی (Strateqy of Containment) کہا جاتا ہے اور جس کا اصل مصنّف امریکی سیاست کار جارج ایف کینن (George F.Kannen) تھا۔

اس حکمتِ عملی کو بروئے کار لانے کے لئے روس کے گرد سیاسی' معاشی اور فوجی بلاکوں اور معاہدات کا ایک ایسا جال پھیلایا گیا جس کے نتیجہ میں وہ اپنی سرحدوں میں محصُور ہو کر رہ سکے اور اُس کی پیش قدمی رک جائے۔

۲۔ امریکی عالمی سیاست کا دُوسرا اصول مقابلہ کی ایسی قوت کا حصُول اور جنگ کو اتنا تباہ کن اور مہنگا بنا دینے کی حکمتِ عملی تھی جس کے نتیجہ میں یا جنگ ناممکن ہو جائے یا مخالف کی تباہی یقینی بنائی جا سکے۔ اسے اصولِ مزاحمت (Strategy of Deterrance) کہتے ہیں۔ اِس مقصد کے حصُول کے لئے فوجی قوت کو بے محابا ترقی دی گئی۔ ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۷ء کے درمیان فوجی سازو سامان میں ۷۰۰ فیصدی کا اضافہ ہُوا۔ جوہری ہتھیاروں کے انبار لگائے گئے۔ بین البرِّ اعظمی میزائل (Intercotinental Ballistic Missiles) تیار کئے گئے' ہوائی اور بحری قوت کو آخری حدوں تک ترقی دی گئی۔ یورپ اور ایشیا میں ایسے فوجی اڈے قائم کئے گئے جن سے بہت کم نوٹس پر اور بڑی سُرعت کے ساتھ مخالف قوتوں پر حملہ کیا جا سکے۔ (Forward Deployment Forces Projection Capability) اور اِس امر کی مسلسل کاوش کی گئی کہ تحقیق اور تجربہ کے ذریعہ اسلحہ کے نظام میں تکنیکی فوقیت اور کمیت اور کیفیّت ہر پہلو سے امریکی اسلحہ کی بالادستی قائم رہے۔ اِس کا مظاہرہ روس کے خلاف تو نہ ہو سکا لیکن خلیج کی جنگ میں عراق کے روسی اسلحہ کے مقابلہ میں امریکی اسلحہ نے اپنی فنّی بالادستی کے کچھ نظارے دنیا کو ضرور دکھا دیے۔

۱۹۴۵ء میں دُوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر معاہدہ یالٹا میں بعد جنگ کی دنیا کا نقشہ بنایا گیا تھا جو چند ہی سالوں میں درہم برہم ہو گیا اور ۱۹۴۹ء میں ہی نیٹو کے قیام اور روس کے جوہری طاقت بن جانے سے سرد جنگ کے دَور کو گرما دیا۔ ۱۹۸۹ء بھی ۱۹۴۵ء ہی کی طرح اہم ہے کہ اس سال افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی اور مشرقی یورپ کے روس کے چنگل سے نکلنے سے سرد

جنگ کے دَور کے اختتام کا اعلان ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں کویت پر عراق کی جارحیت اور اُس کے جواب میں امریکہ کی قیادت میں روس کے تعاون سے جنوری، فروری ۱۹۹۱ء کی خلیج کی جنگ نے نئے عالمی سیاسی دَور کے خدوخال نمایاں کئے اور پھر اگست ۱۹۹۱ء میں روس میں اشتراکیت کے چراغ کی آخری بھڑک نے حالات کی نئی کروٹ کو بالکل ہی نمایاں کر دیا۔ ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۱ء تک کا زمانہ ہی وہ فیصلہ کن زمانہ ہے جس میں امریکہ نے اپنے تصوّر کے مطابق نئے عالمی نظام کا نقشہ بنایا ہے اور خلیج کی جنگ سے اس میں رنگ بھرا ہے۔

الفاظ جو بھی استعمال کئے جائیں حقیقت یہ ہے کہ اس نئے نظام کے بنیادی خدوخال مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ امریکہ دنیا کی واحد عالمی قوت ہے۔ دنیا کے تمام ملکوں کو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا اور امریکہ سے اور خُود آپس میں تعلقات کو اُستوار کرنے میں اس کو بنیاد بنانا ہو گا۔

۲۔ روس میں اشتراکیت کی پسپائی اور روسی ایمپائر کا تتربتر ہونا صرف اشتراکیت کی شکست ہی نہیں بلکہ مغربی لبرلزم، سرمایہ داری، جمہوری طرزِ حکومت اور منڈی کی معیشت کے تصوّر کی فتح ہے۔ اب یہ دعویٰ بھی کیا جا رہا ہے کہ جس طرح امریکہ دنیا کی واحد عالمی طاقت ہے اِسی طرح مغربی لبرلزم اور سرمایہ داری اب دنیا کا غالب سیاسی اور معاشی نظام بھی ہے اِس سلسلہ میں امریکی حکومت کے ایک مشیر فرانسس فاکویامی کے مضامین کو بڑی ہَوا دی جا رہی ہے جِس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اب تاریخ اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے اور مغربی نظام کو فیصلہ کن بالادستی حاصل ہو گئی ہے۔ (۷)

امریکہ کا یہ ہدف ہو گا کہ وہ اس عالمی حیثیت کو قائم رکھے۔

۱۔ سرد جنگ کے دورِ تحدید (Containment) کے مقابلے میں نئے نظام میں اجتماعی سلامتی (Collective Security) کا انتظام کیا جائے گا جِس کی قیادت امریکہ کرے گا البتہ اس کو عالمی ادارہ اقوامِ متحدہ کی چھتری حاصل ہو گی۔ اجتماعی سلامتی کے اس نظام کے معنی یہ ہوں گے کہ جہاں کہیں سلامتی کے لئے کوئی خطرہ رُونما ہو اُس کا تدارک کیا جائے۔

۲۔ دنیا میں کہیں بھی اور خصوصیّت سے یورپ، ایشیا اور افریقہ میں اب کسی ملک کو یہ موقع نہیں ملنا چاہیے کہ وہ ایک عالمی قوت کی حیثیت سے اُبھر سکے۔ علاقائی توازن کی بھی حفاظت کی جائے گی اور جہاں کہیں علاقائی توازن کو خطرہ ہو یعنی علاقے میں جن قوتوں کو بالادستی حاصل ہے (جیسے مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل) ان کی حیثیت کو تبدیل ہونے سے بچایا جائے گا۔ مشرقِ وسطیٰ

میں اسرائیل کا تحفظ اور پورے علاقے پر اُس کی بالادستی کا قیام اس نئے نظام کا ایک لازمی حصہ ہے۔
۳۔ امریکہ کے عالمی مفادات کا تحفظ جس میں سرِ فہرست تیل کی رسد' قیمت اور ماخذ پر کنٹرول ہے' خواہ یہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ' اس طرح امریکہ کے دُوسرے مفادات کی دیکھ بھال جن میں عالمی منڈیوں تک امریکی مصنوعات کی رسائی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔
۴۔ اسلحہ کی تیاری' تحقیق اور ترقی کے نظام پر کنٹرول جس کے نتیجہ میں دنیا میں ایسے دوسرے ممالک یا مراکز وجود میں نہ آسکیں جو اسلحہ کے میدان میں امریکہ کی بالادستی کے لئے اب یا مستقبل میں خطرہ بن سکتے ہوں۔ اِس سلسلہ میں جوہری' کیمیاوی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کے فروغ کو روکنا فوری اہمیت کا حامل ہے۔ اگر اس کام کو معاہدات اور عالمی نگرانی کے ذریعہ انجام دیا جا سکے تو فھو المراد لیکن اگر ضرورت پڑے تو قوت کا استعمال کر کے بھی اسلحہ کے اِس پھیلاؤ کو روکنا اس عالمی نظام کے اھداف میں سے ایک ہے۔
۵۔ روس' جرمنی' جاپان' انگلستان اور فرانس کو بڑی طاقتوں نہ کہ عالمی طاقتوں کی حیثیت سے تسلیم کرنا البتہ اس امر کی کوشش کہ اِس میں سے بھی کوئی مستقبل میں عالمی طاقت نہ بن سکے۔ اِس سلسلہ میں روس کو معاشی طور پر اپنے زیرِ اثر لانے اور جرمنی اور جاپان کی معاشی قوت اور مسابقت کی طاقت کو عالمی شراکت کے کسی نظام کے تابع کر کے حریف عالمی قوت بننے سے روکنا۔

یہ وہ بنیادی اہداف ہیں جو امریکہ کے نئے عالمی نظام کے حدودِ اربعہ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اِس کے نتیجہ کے طور پر عالمی سیاست میں امریکہ کی ترجیحات بدل چکی ہیں:
(۱) اب نہ افغانستان کا مسئلہ اہم ہے اور نہ پاکستان کی کوئی جیو اسٹریٹیجک اہمیت ہے۔
(۲) روس اب مخالف نہیں حلیف قوت ہے اور وسط ایشیا میں کسی ایسی قوت کا اُبھرنا جو روس کے لئے خطرہ بن سکتی ہو مغرب کے لئے قابلِ قبول نہیں۔
(۳) اسرائیل کی بالادستی کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ فلسطین کے مسئلہ کو تحلیل کو دیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک طرف "اسلامی بنیاد پرستوں" کو قابو میں کیا جائے تو دُوسری طرف اسرائیل کو اُس کے سارے ہمسایہ عرب ممالک سے کیمپ ڈیوڈ طرز کے معاہدات میں جوڑ دیا جائے اور سب سے بڑھ کر کویت امریکہ دفاعی معاہدہ کے انداز پر علاقے کے دُوسرے ممالک سے بھی دفاعی معاہدے کئے جائیں تا کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی افواج کے قیام اور اسلحہ

کے مستقل ذخیروں کا بندوبست کرلیا جائے۔

(۴) پوری دنیا میں احیاءِ اِسلام کی تحریکوں کی مخالفت کی جائے اور امریکہ مخالفت کی بنیاد پر اِن تحریکوں کو دبانے اور دبوانے کی کوشش کی جائے۔

(۵) ہندوستان کو جنوبی ایشیا میں ایک علاقائی قوت کی حیثیت سے تقویت دی جائے تاکہ پاکستان، ایران اور افغانستان کے اثرات کو محدود کیا جا سکے۔

نئی پالیسی کی یہ تمام شاخیں امریکی عالمی نظام (Pax Americana) کا لازمی حصہ ہیں اور پاکستان اور عالمِ اِسلام اِن سے صرفِ نظر کر کے جو حکمتِ عملی بھی بنائے گا وہ خطرات سے پُر ہے۔

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں جو تجزیہ کیا ہے یہ بھی محض نظری تجزیہ نہیں بلکہ حقائق اور مغربی اقوام، خصوصیت سے امریکہ کے پالیسی سازوں کی سوچ کے دستاویزی ریکارڈ کا خلاصہ ہے۔ ہم اپنے دعوے کی تائید کے لئے صرف چند اہم حوالے پیش کرتے ہیں تاکہ مُسلمان پالیسی سازوں کو حقائق کو جیسے کہ وہ ہیں سمجھنے میں مدد ملے۔

کارٹر کے سابق سیکیورٹی ایڈوائزر پروفیسر ز بگنیو برزیزنسکی (Zbegniew Brzezinski) خلیج کی جنگ اور نئے عالمی نظام کا جائزہ لیتے ہوئے صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ:

"(مشرقِ وسطی کے لئے) امریکہ کی فوجی چھتری ناگزیر ہو گی۔ بالآخر حالات جو بھی ہوں، اس علاقہ میں امریکہ کی فوجی موجودگی مستقل نوعیت کی ہو گی۔ گمان غالب ہے کہ فوجوں کا مستقر کویت ہو گا یا سعودی عرب یا دونوں۔ آخر تو یہ دونوں ملک ہمارے حاشیہ نشین ملک (Client Regime) ہی ہیں۔یہ بہت دولت مند بھی ہیں اور غیر محفوظ (Vulnerable) بھی۔ فطری طور پر اِن کا سارا انحصار امریکہ پر ہے ------"

"حالات کا تقاضا ہے اور امریکہ کے لئے ناگزیر ہو گیا ہے کہ اِس نظام کے قیام کے لئے جو منصفانہ ہو اور امن کا ضامن، زیادہ تیزی کے ساتھ متحرک ہو جائے"۔(۸)

"لندن آبزرور" میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں برزیزنسکی اِنہی باتوں کا اعادہ کرتا ہے اور دُوسری جنگ کے بعد، صدر ٹرومین نے یورپ کی تعمیر اور دنیا میں اپنے سیاسی معاہدوں کے بارے میں، جس تحرک کا مظاہرہ کیا تھا، امریکہ کو آج پھر اس کی دعوت دی ہے۔ اُس کا مشورہ ہے۔

"آج اس پُورے علاقے کی قسمت امریکہ کے ہاتھوں میں ہے جسے اِس سے پہلے کبھی اتنا اثرو رسُوخ حاصل نہ تھا جو آج حاصل ہے۔ اب امریکہ کی ذمّہ داری ہے کہ علاقہ کے لوگوں کی مشکلات کے حل کے لئے اپنی ذمّہ داریاں ادا کرے ---- جغرافیائی اور سیاسی ہی نہیں خُود اخلاقی اسباب سے بھی ضروری ہے کہ امریکہ جس سرگرمی کا مظاہرہ کرے (وہ ۱۹۴۵ء کے بعد والی سرگرمی سے) کم نہ ہو"۔(۹)

امریکہ کے عالمی رول کے بارے میں ایک اور دانشور Elwt A. Cohen مجلّہ The National Interest میں لکھتا ہے :

"آج یہ امریکہ کے قومی مفاد میں ہے' دُوسرے اور ممالک کے بھی' کہ امریکہ شعوری طور پر طے کرے کہ اسے دنیا کی مضبوط ترین عسکری قوت کی حیثیت سے باقی رہنا ہے' اور ہمیں یقین ہے کہ مستقبل میں اِس بالادستی کو اس سے کم وسائل (Cost) کے صرف سے قائم رکھا جا سکتا ہے جو سرد جنگ کے زمانہ میں کرنا پڑتے تھے۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ امریکی عوام کو اس قومی مفاد کے بارے میں مطمئن کرنا آسان نہیں' لیکن یہ امریکی قیادت کی ذمّہ داری ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر ہم اُن کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو پھر نئی صدی کے آغاز پر دنیا ایسی پُرسکون اور محفوظ جگہ نہ ہوگی جیسی ۱۹۹۰ء کے اس موسمِ خزاں میں ہے"۔(۱۰)

لندن کے ایک اخبار میں "گارڈین" کا مقالہ نگار ڈیوڈ مارکوانڈ (David Marquand) رقمطراز ہے:

"جدید تاریخ کی پہلی حقیقی جنگ (خلیج کی جنگ) جس کا طرّۂ امتیاز اعلیٰ ٹیکنالوجی کا استعمال تھا۔ امریکی افواج نہ صرف اعلیٰ فوجی کارکردگی میں ممتاز تھیں بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی (امریکہ) پُوری جنگ پر چھایا ہوا تھا۔ کولیشن کے عرب ارکان تو امریکہ کے حاشیہ بردار تھے۔ انگلستان امریکہ کے پُرجوش سپاہی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ آغاز میں بغاوت کے سارے نازک لمحات کے باوجود فرانس بھی ہمراہی ثابت ہُوا خواہ جوش و جذبہ میں کم ترقی کیوں نہ ہو۔ باقی یورپ اس کھیل سے تقریباً" باہر رہا۔ روس ایک پالیسی پر ضرور گامزن تھا مگر یہ پالیسی بے حد کمزور اور غیر مؤثر تھی۔ ہمیں اعتراف کر لینا چاہیے کہ سرد جنگ کے دور کا توازنِ قوت پارہ پارہ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ کسی نئے توازن نے نہیں لی ہے بحالتِ موجودہ جو کچھ نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ جس نئے عالمی نظام کی دھوم ہے وہ صرف امریکی نظام Pax American ہی ہوتا نظر آرہا ہے۔"(۱۱)

امریکہ کی وزارتِ دفاع کا ایک سابق افسر اور جارج ٹاون یونیورسٹی کا پروفیسر ارل ریوی نال مشہور رسالہ Foreign Policy میں ایک پُر مغز مضمون میں اپنا تجزیہ بہ ایں الفاظ پیش کرتا ہے:

"امریکہ اسٹریٹیجک خُود مختاری کی راہ پر بڑے جارحانہ انداز میں گامزن ہو گیا ہے۔ خلیج فارس میں فوج بندی امریکہ کی اس پُر عزم انفرادیت پسندی اور خُود کاری (Unilateralism) کے آغاز کی علامت اور اس کے اس نئے مقام و مرتبہ کی مظہر ہے جو "دنیا کی واحد عالمی قوت" کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ شاید اس

کا نام نظریۂ بُش (Bush Doctrine) ہے لیکن اس کی نوعیت اور حقیقی مقاصد ابھی پردۂ اخفا میں ہیں۔ (جو کچھ نظر آرہا ہے اس کی بنیاد پر) کہا جا سکتا ہے کہ اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ اب امریکہ سرد جنگ کی بچی ہوئی واحد عالمی قوت کی حیثیت سے' اپنی عسکری قوت کو' جسے دفاعی بجٹ سمیت وہ اب کچھ کم کرنے کی پوزیشن میں تھا' برقرار رکھنے پر مجبور ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ اپنے عالمی اثرات کو مستحکم رکھ سکے۔ (گلف کے واقعات شاہد ہیں کہ) روس سے دو طرفہ مسابقت (خصوصیت سے یورپ میں) کے ختم ہو جانے کے باعث اب امریکی حکمتِ عملی دُوسرے علاقوں اور معاملات میں مؤثر مداخلت سے عبارت نظر آتی ہے۔ تاکہ اس مداخلت کے ذریعہ ان تنازعات کو امریکہ کے مفاد کے مطابق طے کرایا جا سکے۔ نیز یہ بھی کہ امریکہ کے مفادات کی تعریف میں بھی خاصی وسعت برتی جائے گی تاکہ تمام دنیا کے کسی بھی علاقے میں استحکام اور نظم کا قیام اس میں شامل ہو سکے۔"(۱۲)

ایک اور امریکی مبصر' جو محض ایک تجزیہ نگار نہیں بلکہ خُود بھی اس پالیسی کا داعی ہے' جان اوسولیوان امریکی مجلہ "نیشنل ریویو" کے ایک مضمون میں امریکی حکمتِ عملی کے مختلف پہلو واضح کرتا ہے جو اس نئے نظام کے رُخ سے اس امریکی صاف گوئی کے ساتھ جو امریکہ کے دائیں بازو کا طُرّہ ہے پردہ اٹھاتے ہیں:

"بلا شبہ امریکہ واحد عالمی طاقت ہو گا جو آزادانہ طور پر اور صرف اپنی مرضی سے فوجی مداخلت کا فیصلہ کرے گا خُواہ اُس کا تعلق ایسی کولیشن ہی سے کیوں نہ ہو جو علاقے میں امن کو خطرات سے نمٹنے کے لئے کی جائے البتہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ امریکی اقدامات کو اقوامِ متحدہ کی سرپرستی حاصل ہو' خُواہ اس کے لئے عالمی ادارہ کو کچھ ضمنی اثر و نفوذ (Influence at the Margin) کا حق دینا پڑے"۔

"صرف طاقت ہی سے طاقت کی کاٹ ممکن ہے۔ اور جب مداخلت کرنی ہی پڑ جائے تو پھر اس کو بہت تیز رفتار اور سفاکانہ ہونا چاہیے۔ اِس اصول کے مطابق بروقت ایک گھونسا کافی ہوتا ہے جب کہ بعد میں توپ کی حاجت ہو گی۔ خلیج میں امریکہ نے اِس پالیسی پر عمل کیا ہے۔ یہ غلبہ اور پھیلاؤ کے امریکی اسلُوب کا پیش خیمہ ہے جس کی بنیاد امریکہ کی عسکری بالادستی پر ہو گی اور جس میں اسے سابقہ بڑی طاقتوں مثلاً برطانیہ اور فرانس کی تائید ہو گی اور جس میں جرمنی اور جاپان جیسے ملکوں کا سرمایہ اس کام آئے گا"۔

بڑی صفائی اور بڑی ڈھٹائی سے صاحبِ مضمون لکھتا ہے کہ:

"اِس نظام میں امریکہ کی حیثیت وہی ہو گی جو قرونِ وسطیٰ کے فیوڈل معاشرہ میں بادشاہ کی ہوتی تھی یعنی اصل حاکمِ اعلیٰ (Sole Sovereign) جسے قوت کے استعمال کے لئے مکمل اختیار حاصل ہوتا تھا۔ البتہ جو دُوسروں سے خاصی تعداد میں سپاہی اور سرمایہ حاصل کر سکتا ہو اور اُن کے فراہم کرنے والوں کے خیالات و احساسات کا وہ کچھ پاس بھی کر لیتا ہو۔ رہا معاملہ پارلیمنٹ کا تو وہ اس سے اخلاقی تائید حاصل کرنے کے لئے نیم دلانہ معاملہ کرتا ہو اور جب چاہے اُسے نظر انداز کر سکتا ہو"۔(۱۳)

اس تمثیل میں "بادشاہ" امریکہ ہے "فیوڈل لارڈز" کی حیثیت کولیشن کے دُوسرے اراکین کی ہے جیسے انگلستان، فرانس، جرمنی، جاپان اور شرقِ اوسط کے ممالک اور "پارلیمنٹ" کا کردار اقوامِ متحدہ ادا کرتی نظر آرہی ہے یہ ہے امریکہ کے نئے نظام کا اصل چہرہ۔

بس ایک پہلو کا ذکر اور ہو جائے اور وہ یہ کہ امریکی مفاد کو درپیش آنے والے خطرات کا تعلق صرف عسکری خطرات اور معاشی مفادات ہی سے نہیں بلکہ اس میں دُوسرے ملکوں کا آزاد رویّہ بھی ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ جس کی حیثیّت ایک طرح کی بغاوت کی ہو گی۔

پھر اِس ذیل میں "مُسلمانوں کی بنیاد پرستی" بھی آتی ہے جو اس نظام کے علمبرداروں کی نگاہ میں مغربی تہذیب و تمدّن کی نعمتوں کو ٹھکرا کر ایک "فرسُودہ نظام" کے احیاء کی "حماقت" کرنے کے مترادف ہے۔ اِس طرح جب بھی کوئی ملک جوہری توانائی کے میدان میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرے گا وہ بس باغی سمجھا جائے گا اور اِس جرم میں گردن زدنی ہو گا۔(۱۴)

امریکہ کے اس نئے نظام میں اسلام اور امتِ مُسلمہ کا کیا مقام ہے اِس کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سابق صدر رچرڈ نکسن نے گورباچوف۔ ریگن ملاقات (۱۹۸۵ء) کے موقع پر مشہور امریکی رسالے (Foreign Affairs) میں اپنے مضمُون میں کہا تھا رُوس اور امریکہ دونوں کو "اسلامی بنیاد پرستی" کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے تمام اختلافات کے باوجود باہم تعاون کرنا چاہیے۔ سابق صدر ریگن کی خُود نوشت ابھی شائع ہُوئی ہے An American Life کے ۵۷ ویں باب میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ اہلِ اِسلام میں آپس کے بے شمار اختلافات ہیں لیکن اسلامی بنیاد پسندی نے اسرائیل دشمنی میں انہیں اس طرح یک جہت کر رکھا ہے کہ اپنے سارے اختلافات بُھول کر نہ صرف عرب بلکہ غیر عرب حتیٰ کہ ایران اور افغانستان کے باشندے بھی اسرائیل کی تباہی پر کمربستہ ہیں۔ اِسلامی بنیاد پسندی، جو آزاد خیال سیکولر حکومتوں کی دشمن ہے، اسلامی نظام کی علمبردار ہے اور اس مقصد کے حصُول کے لئے اللہ کے نام پر کشت و خُون اور دہشت گردی تک سے گریز نہیں کرتی، اس لئے کہ اِسلامی بنیاد پسندی نے اپنے پیروکاروں کو یہ سکھا رکھا ہے کہ وہ مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہوتے ہُوئے اگر مارے گئے تو شہید ہوں گے اور باغِ عدن کے سارے دروازے اُن پر وَا ہوں گے انہیں متعصب بنیاد پسندوں کے ہاتھوں ریاستہائے متحدہ امریکہ مشرقِ وسطیٰ میں اپنے دو عظیم وفادار اتحادیوں، شہنشاہِ ایران اور انور سادات سے محروم ہُوا۔ اگر اِسلامی بنیاد پسندوں کو عرُوج نصیب ہو گیا تو دنیا صدیوں پرانی رجعت پسندی سے دو چار ہو جائے گی۔ بالخصوص اگر ایٹمی اور کیمیائی اسلحے ان مشتعل مزاج عناصر کے ہاتھ آگئے اور انہیں اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کرنا اُنہوں نے سیکھ لیا۔"

"زندگی بھر میرا بہت ساری حقیقتوں پر ایمان رہا ہے لیکن اگر یہ جرم ہے تو مَیں فخر کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ یہ میرا ایمان کہ امریکہ پر اسرائیل کی بقا کو یقینی بنانا ایک لازمی امر ہے"۔

اور اسرائیل کے دفاع کے لئے امریکہ کی حکمتِ عملی میں جس نئے عنصر کا اضافہ ہُوا ہے وہ بھی ملحوظ رہے تو بہتر ہے۔ "Foreign Policy" کا ایڈیٹر چارلز ولیم مے نز خلیج کی جنگ پر اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے کہ اِس جنگ کے اصل اسباب چار تھے یعنی امریکہ اور مغربی اقوام کے لئے تیل کے حصوُل کو محفوُظ کرنا، عالمی نظام کا قیام، امریکہ کی سلامتی اور اسرائیل کا تحفظ۔ وہ لکھتا ہے:

"امریکہ اور اسرائیل کے تعلقات اب نئی گہرائیوں سے آشنا ہو رہے ہیں۔ خلیج کے اس بحُران میں امریکہ اسرائیل کے مالی سرپرست (Financier) سے بڑھ کر اب اسرائیل کا محافظ (Protector) بن گیا ہے۔ تاریخ میں پہلی بار یہ ہُوا ہے کہ اسرائیل اس امر کا بچشمِ سر مشاہدہ کر رہا ہے کہ اس کے ایک دوست ملک کی افواج اس کے ایک بہت بڑے دشمن کو قابو میں کرنے اور اس کی عسکری صلاحیت کو ختم کرنے کا کام انجام دے رہی ہیں"۔ (۱۵)

آخر میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے ایک تحقیقی مقالہ کا کچھ حصّہ بھی پیشِ خدمت ہے جو تصویر کو مکمّل کرنے میں مدد دے گا:

"رُونما ہونے والی دنیا کے لئے شاید سب سے بہتر عنوان Uni-Multipolar World ہے یعنی جس میں ریاست ہائے متحدہ وہ واحد ملک ہے جسے سُپرپاور کہا جا سکتا ہے اوراس کے ساتھ چھ ملک ایسے ہیں جنہیں بڑی طاقتیں کہنا مناسب ہو گا یعنی روس، جاپان، چین، جرمنی، انگلستان اور فرانس"۔

"اِس دنیا میں امریکہ کے تین بڑے اسٹرٹیجک مفادات ہیں:

(۱) ریاست ہائے متحدہ امریکہ سب سے بڑی عالمی طاقت کی حیثیت سے اپنی حیثیت کو باقی رکھے اور اس کا یہ تقاضا بھی ہے کہ آنے والے عشروں میں جاپان کے معاشی چیلنج کا بھی مقابلہ کیا جائے۔

(۲) یورپ اور ایشیا میں کسی بالاتر سیاسی یا فوجی قوت کو نہ اُبھرنے دیا جائے جو Hegemonice Power کی حامل ہو سکے۔

(۳) تیسری دنیا میں امریکہ کے حقیقی مفادات کا تحفظ اور اس میں اوّلیت خلیج فارس اور وسط امریکہ میں ریاست ہائے متحدہ کے مفادات کے تحفظ کو حاصل ہو گی"۔ (۱۶)

یہ تو ہے نئے نظام کا وہ خاکہ جسے امریکہ اور اس کے حواری قائم کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہیں۔ خلیج کے سانحہ کے سبھی کردار اِس نظام کو حقیقت کا جامہ پہنانے میں اپنا اپنا رول ادا کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اِس نئے نظام کو روس کے زوال، خلیج کے بحُران اور اِسلامی احیاء کے اِمکانی تناظر سے ہٹ کر نہیں سمجھا جا سکتا۔ مندرجہ بالا صفحات میں ہم نے اِس نظام

کے چند بنیادی خدوخال کو اُن کے حقیقی رُوپ میں پیش کیا ہے لیکن ابھی اِس امر کی ضرورت ہے کہ تاریخی معروضیت کے ساتھ اِس امر کا جائزہ بھی لیا جائے کہ اِس نظام کے قائم ہونے کے کیا امکانات ہیں' کیا اِنسانیت کے پاس اِس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں کہ اِس نظام کے آگے سپر ڈال دے۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اگر یہ نظام قائم اور مستحکم ہو گیا تو اِنسانیت کے لئے اِس کے کیا مضمرات ہوں گے؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ وقت کے اِس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے امتِ مُسلمہ کی کیا ذمّہ داری ہے۔ ہم آئندہ "اشارات" میں اِنہی امور پر گفتگو کریں گے۔

---

(۱) "New World Order" گارڈین اسٹیڈیز جلد اوّل' اپریل ۱۹۹۱ء' گارڈین کا منیجر ایڈیٹر ایلن روس بریجز اپنے ابتدائیہ میں لکھتا ہے کہ:

"اِس عنوان کے اختتام پر پُوری A question mark was judiciously placed at the end of the title. دیانت کے ساتھ ایک سوالیہ نشان کا اضافہ کر دیا گیا تھا"۔

(۲) صدر بش کی تقریر امریکی کانگرس کے سامنے ۱۱ ستمبر ۱۹۹۰ء بحوالہ مجلہ Survival انٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ فور اسٹر یٹیجک اسٹڈیز لندن' مئی / جون ۱۹۹۱ء' صفحہ ۱۹۵ ۔

(۳) بحوالہ واشنگٹن پوسٹ' ۲۶ مئی ۱۹۹۱ء ۔

(۴) بحوالہ لورنس فریڈ مین کا مضمون The Gulf and the New World Order مجلہ Survival لندن' مئی / جون ۱۹۹۱ء' صفحہ ۶-۱۹۵ ۔

(۵) ٹائم' ۷ جنوری ۱۹۹۰ء ۔

(۶) سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن ان جنگوں کی تعداد ۱۳۰ اور ان میں مرنے والوں کی تعداد ۱۸ ملین یعنی ایک کروڑ اسی لاکھ قرار دیتا ہے۔ 1999 War Victory لندن' صفحہ ۱۳۱ ۔

(۷) فرانسس فوکویاما (Francis Fukuyame) کا مضمون The End of History امریکہ کے مشہور رسالہ The National Interest کی ۱۹۸۹ء Summer کی اشاعت میں شائع ہُوا۔ اِس کے بعد موصوف کا دُوسرا مضمون ستمبر ۱۹۸۹ء میں ہونو لولو کے سنڈے اسٹار میں "Are we Witnessing the End of History?" کے نام سے شائع ہُوا۔ تیسرا مضمون مشہور امریکی رسالہ Fortune میں جنوری ۱۹۹۰ء میں شائع ہُوا اور اس کا عنوان "?Are We at the End of History" تھا۔ ان مضامین کا مرکزی خیال یہ ہے کہ موجودہ صدی' جو اب اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے' معاشی اور سیاسی لبرلزم کی ایسی فتح پر منتج ہُوئی ہے جسے چھپایا نہیں جا سکتا۔

Unabashed victory of economical and political liberelism نیز "ہم اب غالباً" انسانیت کے نظریاتی اِرتقاء کی آخری بلندیوں کا نظارہ کر رہے ہیں اور تاریخ کا یہ خزانہ عبارت ہے مغرب کی لبرل جمہوریت سے جو انسانیت کے لئے حکمرانی کا آخری نظام ہے"۔

"We may be witnessing the end point of mankind's ideological evolution and the emergence of western liberel democracy as the final form of human government."

(۸) Zbegniew Brzezinski کا انٹرویو Global Viewpoint کے Nathan Gardis کے ساتھ' مطبوعہ لاس اینجلز ٹائمز' The News' یکم مارچ ۱۹۹۱ء۔